شاگردِ شبلی مولانا حمید الدین فراہی: ایک تعارف

شاہین فاطمہ (ریسرچ اسکالر)

جامعہ ملیہ اسلامیہ

ملخص

مولانا حمید الدین فراہی 1863ء میں قصبہ پھریہہ، اعظم گڑھ میں پیدا ہوئے۔ شبلی کے خاص شاگرد کے علاوہ مولانا فراہی علامہ شبلی نعمانی کے ماموزاد بھائی بھی تھے۔ شبلی کی والدہ اور فراہی کے والد سگے بھائی بہن تھے۔ اسی شبلی اور فراہی کے گھریلو مراسم کے سبب مولانا فراہی کو بچپن سے ہی شبلی نعمانی کی شاگردی کا شرف حاصل رہا۔ بچپن سے ہی مولانا فراہی میں وہ خصوصیات تھیں جو ایک ذہین بچے میں ہوتی ہیں۔ مولانا فراہی کے استادوں میں مولانا شبلی نعمانی کے علاوہ مولانا فاروق چریا کوٹی، مولانا عبدالحئ فرنگی محلی اور مولانا فیض الحسن سہارنپوری وغیرہ اساتذہ کا نام قابل اہم ہے۔ مولانا حمید الدین فراہی کو ہم ماہر قرآنیات کے طور سے جانتے ہیں۔ مولانا کے مطابق قرآن انسانی زندگی کے نجات کا ذریعہ ہے۔ قرآن کی صحیح سمجھ اور اس کو اپنی زندگیوں میں اتار کر ہی انسانیت کی کامیابی ممکن ہے۔ مولانا فراہی نے جس وقت قرآن کے مطالعے کا باقاعدہ آغاز کیا اس وقت مغرب سے قرآن مجید کو لے کر طرح طرح کے اعتراضات کیے جارہے تھے۔ دوسری طرف سرسید عقلی دلائل کی روشنی میں قرآن کی نئی نئی تاویلات پیش کر رہے تھے۔ مولانا فراہی ان تمام صورت حال سے آگاہ تھے۔ انھوں نے خود قرآن کی تفسیر لکھنے کی سعی کی۔ انھوں نے اپنی تمام زندگی قرآن کی تفہیم و تعلیم میں صرف کردی۔ ان کی شاعری میں بھی قرآنی رنگ صاف طور سے دیکھا جاسکتا ہے۔

شاگردِ شبلی مولانا حمید الدین فراہی: ایک تعارف

مولانا فراہی نے جب ہوش سنبھالا تو ہندوستان کا ماحول اس وقت بالکل سازگار نہ تھا۔ 1857ء کی بغاوت ناکام ہو چکی تھی۔ ہندوستانیوں پر انگریزوں کی ظلم و زیادتی بڑھ رہی تھی۔ بغاوت کی ناکامی کے باعث ہندوستانی مسلمان اور ان کی تعلیم انگریزی حکومت کے نشانے پر سخت ٹھہری۔ ایسے میں ایک طرف تو سرسید اور ان کے بعض رفقا نے ہندوستانی مسلمانوں کو جدید تعلیم کی طرف توجہ دلائی وہیں دوسری طرف شبلی اور ان کے رفقا و شاگردوں نے اسلامی تعلیم کو بھی مسلمانوں کے لیے اول جانا۔ مولانا فراہی کی خوش بختی یہ رہی کہ انھیں ان دونوں طرح کے مکتب فکر کے لوگوں سے رابطہ رہا۔ مگر شبلی نعمانی کے ماموزاد بھائی اور ان کے عزیز شاگرد ہونے کی وجہ سے ان کا جھکاؤ شبلیت کی طرف زیادہ رہا۔ مولانا فراہی کے تعلق سے یہ ایک بنیادی بات ہے اور اس کی بڑی وجہ یہ رہی کہ ان کی تعلیم و تربیت مکمل طور سے شبلی نعمانی کی دیکھ ریکھ اور نگرانی میں ہوئی چونکہ شبلی اپنے خاندان میں ذہین اور تعلیم یافتہ تسلیم کیے جاتے تھے اس لیے خاندان کے ہر بچے کو ان کے قریب کرنے کی کوشش کی جاتی تھی۔ ان تمام بچوں میں شبلی کی نظر عنایت کے زیادہ حقدار مولانا فراہی ہی ٹھہرے۔ علامہ شبلی نے ہر موقع پر مولانا فراہی کی تربیت کی طرف توجہ دی اور علی گڑھ میں بھی قیام کے دوران علامہ شبلی کی یہ کوشش رہی کہ مولانا فراہی کو جلد از جلد علی گڑھ بلایا جائے جس سے ان کی تعلیم میں مزید نکھار پیدا ہو۔ اور مولانا فراہی کی صلاحیت کو پروان چڑھنے کا موقع ملے۔

علامہ شبلی شبلی نعمانی خود اپنے وقت کے بڑے عالم ہونے کے باوجود مولانا فراہی سے قدم قدم پر رائے لیتے رہتے تھے۔ سیرت النبی لکھنے کے دوران علامہ شبلی اور مولانا فراہی کے درمیان خط و کتابت کا سلسلہ کافی بڑھ گیا تھا۔ مکاتیب شبلی حصہ دوم میں بیشتر خط مولانا فراہی کے نام ہیں۔ ان خطوط کو پڑھنے سے صاف اندازہ ہوتا ہے کہ علامہ شبلی کس حد تک مولانا فراہی کی علمی لیاقت اور دانشوری کے معترف تھے۔ ساتھ ہی ساتھ علامہ شبلی کی نظر میں مولانا فراہی ایک اعلیٰ درجے کے محقق تھے۔ مکاتیب شبلی میں بیشتر خطوط ایسے ملیں گے جس میں علامہ شبلی مولانا فراہی سے کسی مسئلے کے متعلق تحقیقی استفسار کرتے ہوئے نظر

آتے ہیں۔اور خاص کر جب کوئی قرآنی مسئلہ درپیش ہوتا تو علامہ شبلی لازمی طور سے مولانا فراہی کو خط لکھتے اوران کی رائے جاننے کے خواہاں ہوتے۔اسی طرح سے جہاں کہیں علامہ شبلی کو قرآن کے ساتھ ساتھ دیگر کتب سماویہ توریت، انجیل اور دیگر صحف بنی اسرائیل سے استفادے کی ضرورت پیش آتی وہاں بھی وہ اس مسئلے کے بابت مولانا فراہی سے رجوع کرتے۔اس تعلق سے سید سلیمان ندوی 'حیات شبلی' میں رقم طراز ہیں کہ:

> ''سیرت کا ان مباحث میں جن کا تعلق صحف بنی اسرائیل اور قرآن پاک سے ہے، وہ اپنے بھائی مولوی حمید الدین صاحب سے جنھوں نے اس قسم کے مسائل پر بہ تحقیق غور کیا تھا، اکثر مشورے کرتے رہتے تھے جن کا حوالہ مکاتیب شبلی میں جا بجا ہے۔''

حیات شبلی، سید سلیمان ندوی، دارالمصنفین، اعظم گڑھ، 1993ء، ص720

سیرت النبی علامہ شبلی نعمانی کا ایک بڑا کام تھا اور اسی لیے مولانا نے اپنی وفات سے قبل جب ان کو یہ اندازہ ہو چلا کہ روح اور جسم کا تعلق زیادہ دنوں تک قائم نہیں رہ سکتا اور کہیں ان کا یہ اہم کام ادھورا رہ جانے کی وجہ سے لوگوں کی توجہ سے دور نہ ہو جائے، انھوں نے اپنے شاگردوں میں سے سید سلیمان ندوی کو چنا اور ان کو یہ ہدایت فرمائی کہ سیرت النبی کو انھیں مکمل کرنا ہے۔ساتھ ہی ساتھ مولانا فراہی سے مشورہ لیتے رہنے کی تاکید بھی فرمائی۔سیرت النبی کے ضمن میں علامہ شبلی اور مولانا فراہی کے مابین خط و کتابت کے تعلق سے یہ ایک یکطرفہ بات ہے کہ ہمیں مکاتیب شبلی کی روشنی میں ان باتوں کا تو علم ہوا جہاں جہاں علامہ شبلی نے مولانا فراہی کی طرف کسی مسئلے کی تحقیق کے لیے رجوع کیا لیکن مولانا فراہی کا اس مسئلے کے بابت کیا جواب رہا اس کو جاننے کے لیے ہمارے پاس کوئی ثبوت نہیں ہے۔مولانا فراہی کے شبلی کو لکھے گئے جوابیہ خطوط ابھی تک محققین کی نظروں سے اوجھل ہیں۔ہاں مکاتیب شبلی میں دوسرے خطوط سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا انھیں برابر خط کا جواب تحریر کرتے رہتے تھے۔لیکن مولانا فراہی کے خطوط کو کائی مجموعہ سامنے نہیں آ سکا۔اگر ہوتا تو اس تعلق سے مولانا فراہی کے نظریاتِ قرآن، نظریاتِ تعلیم اور ان کے دیگر فکر و نظریات کو واضح طور پر سمجھا جا سکتا تھا۔ویسے بھی کسی کے خطوط کو الگ الگ جگہوں سے جمع کرنا مشکل امر ہوتا ہے۔اور مولانا فراہی کے تعلق سے یہ المیہ رہا کہ ان کی خود کی لکھی ہوئی بیشتر کتابیں ان کی

وفات کے بعد شائع ہوئیں۔اس بارے میں پروفیسر یاسین مظہر اپنے مضمون 'سیرت النبی ﷺ میں فکرِ فراہی' میں تحریر کرتے ہیں کہ:

''مکاتیب شبلی سے مولانا شبلی کے استفسار تو معلوم ہوتے ہیں لیکن جوابات فراہی کا اکثر و بیشتر پتہ نہیں چلتا۔ البتہ بعد کے بعض مکاتیب سے ان کی کسی حد تک نشان دہی کی جا سکتی ہے۔ ظاہر ہے کہ ان یک طرفہ معلومات سے سیرت النبی ﷺ میں افادات فراہی کی کمیت اور کیفیت حتمی طور سے متعین نہیں کی جا سکتی۔اس کی ایک صورت یہ ہوسکتی ہے کہ شبلی کی سیرت النبی کے متعلقہ مباحث کا بھی ساتھ ہی تجزیہ کیا جائے اور جہاں جہاں مواد دستیاب ہو وہاں تصانیف فراہی سے بھی موازنہ کیا جائے۔ یہ خاصہ مشکل کام ہے مگر اس سے کہیں زیادہ دشواری یہ ہے کہ تخلیقات شبلی سے افادات فراہی کو کیسے الگ کیا جائے؟ بہر حال مقابلہ و موازنہ اور تجزیہ سے سیرت النبی ﷺ میں فکرِ فراہی کی تاثیر کا کسی حد تک اندازہ تو لگایا ہی جا سکتا ہے۔ خاص کر ان مقامات و مباحث میں جہاں علامہ شبلی نے طرزِ عام سے ہٹ کر فکرِ فراہی کے موافق روش اپنائی ہے۔''

علامہ حمیدالدین فراہی حیات و افکار، مرتب عبیداللہ فراہی، دائرۂ حمیدیہ، اعظم گڑھ، 1992ء، 417-418

مکاتیب شبلی حصہ دوم میں کل 77 ایسے خطوط ہیں جو علامہ شبلی نعمانی نے مولانا فراہی کو لکھے ہیں اور یہ خطوط 1895ء سے شروع ہو کر علامہ شبلی کی وفات کے سال 1914ء تک کے ہیں۔ 19 برسوں کی خط و کتابت کا سلسلہ بہت طویل ہوتا ہے۔ یہ خطوط علامہ شبلی اور مولانا فراہی کے مضبوط تعلق کی دلیل ہیں۔ سیرت النبی ﷺ کے سلسلے کے خطوط 1912ء سے شروع ہوتے ہیں اور 1914ء تک آتے ہیں۔ ان خطوط کی تعداد 22 ہے۔ ان بائیس خطوط میں علامہ شبلی نعمانی کو سیرت النبی ﷺ کے سلسلے میں جہاں جہاں اشکال اور تحقیق کی صورت پیش ہوئی وہاں مولانا حمیدالدین فراہی کو خط لکھ کر تحقیقی اور حتمی باتوں کو معلوم کرنے کی کوشش کی۔ ان میں چند اہم کا ذکر کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ مثلاً حضرت اسماعیلؑ کی قربانی سے متعلق حقیقی معلومات نیز توریت اور بخاری میں اختلاف کا سبب، حضرت ابراہیمؑ کے متعلق

معلومات، وادیٔ بکہ اور مکہ کی وجہ تسمیہ، وادیٔ فاران سے متعلق معلومات، تعمیر کعبہ اور حج وغیرہ کے متعلق تحقیقی معلومات جاننے کی غرض سے علامہ شبلی نے ڈھیروں خطوط مولانا فراہی کو لکھے۔ اس کے علاوہ وقتاً فوقتاً بعض ضمنی امور کی تحقیقی معلومات سے متعلق بھی علامہ شبلی نے مولانا فراہی کو خطوط لکھے۔ اس تعلق سے ڈاکٹر ابوسفیان اصلاحی اپنے مضمون ''مولانا فراہی مکاتیب شبلی کے آئینے میں'' لکھتے ہیں کہ:

> ''علامہ شبلی نے سیرۃ النبی ﷺ میں آنحضرت کی ازواج پر قلم اٹھایا تو خوص طور سے ان واقعات کے بارے میں مولانا فراہی کو تین خطوط تحریر کیے جن کا ذکر قرآن میں آیا ہے۔ اس کے علاوہ صلح حدیبیہ اور سورۃ برأۃ کے نزول سے اس کے تعلق پر روشنی ڈالنے کے لیے علامہ نے ان سے متعدد خطوط میں استفسار کیا۔ سیرۃ النبی ﷺ کی تالیف کے دوران علامہ نے کل ملا کر بائیس خطوط مولانا فراہی کو لکھے ہیں، جس کے جواب میں وہ اپنے گراں قدر نتائج تحقیق علامہ کو بھیجتے تھے جس کی شہادت خود مکاتیب شبلی سے ملتی ہے۔ حق یہ ہے کہ سیرۃ النبی میں شیر شبلی سے قند فراہی کو الگ نہیں کیا جا سکتا۔''

علامہ حمیدالدین فراہی حیات و افکار، مرتب عبیداللہ فراہی، دائرۂ حمیدیہ، اعظم گڑھ، 1992ء، 451-452

مندرجہ بالا معلومات کے علاوہ جہاں شبلی نے مولانا فراہی سے معلومات حاصل کیں وہیں ایک استاد کی حیثیت سے علامہ شبلی نے ان کی رہنمائی بھی کی۔ اپنے بعض خطوط میں علامہ شبلی مولانا فراہی کے مطالعہ کی حد متعین کرتے ہیں۔ اسی سلسلے میں اپنے 18 اپریل، 1913ء کے ایک خط میں علامہ شبلی مولانا فراہی کو لکھتے ہیں کہ:

> ''عزیزی
>
> تم عرب بائدہ یا عرب کی ان مہذب سلطنتوں کے پیچھے نہ پڑو جو یمن شام وغیرہ میں قائم تھیں، ان کے متعلق چند صفحات میں اجمالی بحث کافی ہوگی، تمام کوشش نجد، حجاز، یثرب کے متعلق معلومات کے جمع کرنے میں صرف کرنی چاہیے، تم ان ہی مقامات کے متعلق مزید معلومات بہم پہنچاؤ، آبادی کعبہ اور حضرت ابراہیمؑ و

حضرت اسماعیلؑ کے واقعات میں جس قدر تفصیل مل سکیں محقق، وہ تلاش کرو۔''

مکاتیب شبلی، حصہ اول، مرتب سید سلیمان ندوی، دارالمصنفین شبلی اکیدمی، 2012ء، صفحہ 74

گزشتہ باتوں سے ان دونوں بزرگوں کی استاد و شاگرد کے رشتے کی جو تصویر بنتی ہے ویسی تصویر بہت کم جگہ دیکھنے کو ملتی ہے۔ اور دونوں بزرگوں کے درمیان استاد و شاگرد کا ایسا رشتہ نظر کے سامنے آتا ہے جس کی گہرائی اور قربت کا اندازہ دوسرے رشتوں سے مقدم اور افضل ہے۔

مولانا فراہی نے کتاب اللہ کو اپنی زندگی کا مقصد بنالیا تھا اور اپنی تمام زندگی کو اسی کی تفہیم و تعبیر میں صرف کرنے کا مکمل فیصلہ کرلیا تھا۔ قرآن پر غور و تدبر کے لیے باضابطہ طور پر مولانا فراہی نے اپنے علی گڑھ کے قیام کے دوران ہی کیا۔ یہ وہ وقت تھا جب وہ علی گڑھ میں بطور طالب علم کی حیثیت سے جدید علوم کی تعلیم میں مصروف تھے۔ تاریخی اعتبار سے اگر ہم اس وقت کا جائزہ لیں تو یہ وہ دور تھا جب فکر سرسید کو ایک مقام حاصل ہو چکا تھا۔ اے۔ ایم۔ او کالج کو کھلے عرصہ ہو چکا تھا اور اس کی جڑیں بھی مضبوط ہوتی جا رہی تھیں۔ مگر پھر بھی یہ دور پوری طرح انتشار کا دور تھا۔ خاص کر علم قرآن اور علم تفسیر کو لے کر عوام الناس میں بڑی بےچینی تھی۔ ایک طرف مفسرین حضرات کو یہ احساس ہوا کہ اس بدلتے دور میں قرآن کی فہم اور اس کی معنویت پر نئے سرے سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔ تو دوسری طرف سرسید تھے جو عقلیت پسندی اور منطقی دلائل پر قرآن کو سمجھنا اور سمجھانا چاہ رہے تھے۔ پروفیسر وحید اختر سرسید کے تعلق سے اپنے مضمون میں رقمطراز ہیں کہ:

> ''حیرت اس پر ہوتی ہے کہ سرسید ایسا تعقل پسند صفات و ذات کے بارے میں معتزلہ و اشاعرہ کے انداز میں بال کی کھال نکالنے کو کیوں کر علوم جدیدہ کے طرز فکر سے مطابق کر سکا۔ سرسید معتزلہ کے ہم خیال ہیں۔ وہ خدا کی صفات کو ذات کا عین مانتے ہیں۔ انھوں نے کئی مقامات پر اپنے عقیدے کی توضیح کی اور قرآن مجید کی تفسیر میں ذات و صفات کے مسئلے سے متکلمانہ انداز کی بحث کی ہے۔ وہ معتزلی فکر کو تصوف کی وحدۃ الوجودی فکر سے ملا دینے میں اور فطرت کو مذہب ماننے کے لیے خدا کو عین فطرت مان کر خالق و کائنات کی عینیت کا بھی اقرار کرتے ہیں۔''

انیسویں صدی میں ادب، تاریخ اور تہذیب، مرتب اطہر فاروقی، رضا حیدر، سرور الہدیٰ، مشمولہ: سرسید کی مذہبی فکر، وحید اختر، ثمر آفسیٹ پرنٹرز، نئی دہلی، 2014ء، صفحہ 234

سرسید کے منطقی دلائل اور عقلی تاویلات نے اس دور کے علماء کو ناراضگی میں مبتلا کر رکھا تھا۔ ایسے میں مولانا فراہی کو یہ احساس ہوا کی کتاب اللہ کی اہمیت کو کم جاننا اور مسلم معاشرے کی اس سے دوری ہماری پسماندگی کی ایک بڑی وجہ ہے۔ اس خلیج کو پُر کرنے کے لیے انھوں نے قرآن کی تفسیر لکھنا شروع کی۔ مولانا فراہی کو یہ احساس بھی ہوا کہ قرآن کی تعلیم کا جو طریقہ مسلمانوں میں رائج ہے وہ فرسودہ ہو چکا ہے اسی لیے مسلمان مغربی علوم و افکار سے جلدی متاثر ہو جاتے ہیں۔ ان کے مطابق مسلمانوں کو قرآن مجید کے پیغام کو اپنی زندگی کے تمام شعبہ ہائے حیات میں نافظ کرنے کی ضرورت ہے۔ اور اپنی تمام تر تعلیم کو اسی کتاب کو بنیاد بنا کر اخذ کرنے کی ضرورت ہے۔ اسی مقصد کے پیش نظر مولانا فراہی نے قرآن کی تفسیر لکھنے کی ابتدا کی۔

مولانا حمید الدین فراہی کے مطابق قرآن انسانی زندگی کے نجات کا ذریعہ ہے۔ قرآن کی صحیح سمجھ اور اس کو اپنی زندگیوں میں اتار کر ہی انسانیت کی کامیابی ممکن ہے۔ مولانا فراہی نے جس وقت قرآن کے مطالعے کا باقاعدہ آغاز کیا اس وقت مغرب سے قرآن مجید کو لے کر طرح طرح کے اعتراضات کیے جا رہے تھے۔ دوسری طرف سرسید عقلی دلائل کی روشنی میں قرآن کی نئی نئی تاویلات پیش کر رہے تھے۔ مولانا فراہی ان تمام صورت حال سے آگاہ تھے۔ انھوں نے خود قرآن کی تفسیر لکھنے کی سعی کی۔ اور تفسیر کا موضوع بیشتر ان صورتوں کو بنایا جو مشکل سمجھی جاتی تھیں یا جن کی ایک سے زیادہ تاویلیں بیان کی جاتی تھیں۔ مولانا فراہی کے مطابق قرآن کی مختلف تاویلات ہی اختلاف کا سبب بنی۔ اس تعلق سے مولانا فراہی کا نظریہ یہ تھا کہ قرآن کی مختلف آیات اور صورتوں کی مختلف تاویلیں بحث کا موضوع بنتی ہیں درحقیقت قرآن مجید کے کسی بھی حصہ کی ایک ہی تاویل ہے جو اس کے موضوع اور سیاق و سباق سے میل کھاتی ہے۔ مولانا فراہی کے مطابق قرآن کی مختلف تاولوں نے ہی اختلاف کو پیدا کیا ہے۔ اور اصل میں اگر ہم غور و تدبر سے کام لیں تو کسی بھی آیت کی ایک سے زیادہ تاویل ممکن نہیں۔ فراہی نے اپنی تفسیر میں یہی طریقہ اختیار کیا۔ مولانا فراہی کے مطابق کسی بھی آیت کی وہی تاویل ہونی چاہیے جو اس سورۃ کے مرکزی مضمون کے مطابق ہو۔ مولانا فراہی ہر سورۃ کے اپنے مرکزی مضمون کو بڑی اہمیت دیتے ہیں۔ اس مرکزی مضمون یا سورۃ کے

مرکزی خیال کو وہ عمود کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ اقتباس دیکھیے:

''فراہیؒ کے نزدیک قرآن فہمی کے اصول ومبادی میں اساسی اہمیت ان کے تصور نظم قرآن اور تاویل القرآن بالقرآن کو حاصل ہے۔ کئی مفسرین ان دونوں اصولوں کو تسلیم کرتے ہیں، لیکن ان کے ہاں ان کا اطلاق نہایت محدود اور جزوی طور پر ہوتا ہے۔ فراہیؒ کے نزدیک قرآن مجید اپنی ہیئت، ترتیب، ترکیب، معنی اور موضوع ہر لحاظ سے ایک مربوط ومنظّم کلام ہے۔ ہر سورہ ایک وحدت ہے جس کا ایک مرکزی مضمون ہوتا ہے۔ اس کو وہ عمود کا نام دیتے ہیں۔ سورہ کے تمام مباحث براہ راست یا بالواسطہ عمود سے متعلق ہوتے ہیں۔ سورتیں بھی باہم دگر مربوط ہیں اور ان میں کلام کا ارتقا ہوتا ہے، یہاں تک کہ پورا قرآن ایک منظّم کلام کا جلوہ پیش کرتا ہے۔''

علامہ خالد مسعود، توضیحات فکر فراہی، 2016ء، مجلس حزب الانصار، بھیرہ، ضلع سرگودھا، صفحہ 144

مولانا فراہی نے قرآن کو ایک منظّم کلام کی شکل میں دیکھا۔ اس کی ہر آیت دوسری آیت سے اور ہر سورہ دوسری سورہ سے بالواسطہ ضرور تعلق رکھتی ہے۔ مولانا فراہی قرآن کی تفسیر کے ذریعہ مسلمانوں کو ذہنی پسماندگی سے نکالنا چاہتے تھے۔ اور مغرب کے ذریعہ سے جو شکوک شبہات قرآن مجید پر اٹھائے جا رہے تھے ان کا جواب صحف سماویہ کی روشنی میں مدلل دینا چاہتے تھے۔ اس تعلق سے انھوں نے امعان فی اقسام القرآن لکھی۔ جس میں انھوں نے قرآن کی قسموں کے متعلق مدلل طور سے بحث کی اور قرآن میں پیش کی گئی قسموں کے بارے میں جواز فراہم کیا۔ اس تحقیق کے سلسلے میں انھوں نے قرآن کی قسموں کا بڑی گہرائی سے مطالعہ کیا۔ قسموں کے جواز کی معنویت اور ضرورت پر سیر حاصل گفتگو کی۔ انھوں نے قدیم عربی کلاموں کے ذریعہ اپنی اس کتاب میں مثالیں پیش کیں۔ عربی کلام کے علاوہ عجمی اور دیگر زبانوں کے کلاموں سے قرآن کی قسموں کو جواز اور اس کی معنویت وضرورت واہمیت کو ثابت کیا۔ اور سورۃ کے مضامین اور عمود کے ذریعہ یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ قرآن کا ہر ہر لفظ اپنے آپ میں گہرائی اور گیرائی لیے ہوئے ہے۔ انھوں نے ایک دوسری کتاب مفردات القرآن لکھی جس میں انھوں نے قرآن کے الفاظ کی بناوٹ، اس کے استعمال اور عبرانی زبان میں اس سے ملتے جلتے لفظوں پر تحقیق کر کے قرآنی لفظوں کے

معانی ومفہوم کو بیان کیا ہے۔

التکمیل فی اصول التاویل مولانا فراہی کی قرآن کے موضوع پر لکھی گئی کتابوں میں سے ہے۔ اس کتاب میں مولانا فراہی نے قرآنی تاویلات سے متعلق بحث کی ہے۔ ان کے مطابق قرآن کی تاویلات کے لیے کچھ اصول قوانین مرتب ہونے چاہیے جس کی روشنی میں ہی قرآنی آیتوں کی تاویلیں بیان کی جانی چاہیے۔ مولانا فراہی کے مطابق چونکہ قرآنی تاویلات سے متعلق کوئی حتمی اصول پہلے سے مرتب نہیں ہیں اس لیے ہر شخص قرآن کی مختلف آیات کی تاویل اپنے الگ الگ نظریہ کی بنا پر کرتا ہے اور خود کی تاویل کے علاوہ باقی تمام تاویلوں کو غلط سمجھتا ہے یہی وجہ ہے کہ امت میں ہر ہر آیت کو لے کر اختلاف پیدا ہو گیا ہے۔ اس تعلق سے مولانا فراہی نے اپنی کتاب میں کچھ اصول خود ہی بیان کر دیے ہیں۔ اس میں سب سے پہلی چیز قرآن کا ربط ونظم ہے۔ ان آیتوں کا سیاق وسباق اور ہر آیت کا ماقبل اور مابعد سے تعلق ہی اس آیت کی صحیح تاویل پیش کرنے میں رہنمائی دے سکتا ہے۔ جس کو جانے بغیر قرآنی آیات کی تاویلات پیش کرنے سے کوئی بھی انسان گمرہی کا شکار ہو سکتا ہے۔

مولانا فراہی کی ان کتب کے علاوہ ''الرای الصحیح فی من ھو الذبیح '' ہے۔ جس میں انھوں نے مختلف دلائل کے ذریعہ یہ ثابت کیا ہے کہ اصل میں ابراہیمؑ نے اسحاقؑ کی نہیں بلکہ اسماعیلؑ کی قربانی پیش کرنی چاہی تھی۔ مولانا فراہی کی یہ کتاب عیسائیوں کے اس بیان کا مدلل جواب بنی جہاں وہ اپنی آسمانی کتابوں سے نتیجہ اخذ کر کے یہ کہتے تھے کہ ذبیح حضرت اسحاقؑ ہیں۔ اپنی اس کتاب میں مولانا فراہی نے قرآن کے علاوہ احادیث نیز توریت وانجیل کو شواہدوں کے ذریعہ یہ ثابت کیا کہ اصل میں قربانی حضرت اسماعیلؑ کی پیش کی جارہی تھی۔ 'الرای الصحیح فی من ھو الذبیح' کے علاوہ مولانا فراہی نے ''جمھرۃ البلاغۃ '' نامی کتاب تحریر کی۔ اس کتاب میں مولانا نے قرآن کے سمجھنے کے لیے عربی فصاحت وبلاغت پر سیر حاصل گفتگو کی ہے۔ اور مثالوں کے لیے قرآن کی آیات کے علاوہ دور جاہلیت کے ادباء اور فصحائے ادب کے کلاموں کو بھی پیش کیا ہے۔ مولانا فراہی کی یہ کتابیں اصولی نوعیت کی ہے۔ جن سے ان کے نظریات واضح ہوتے ہیں۔ انھوں نے قرآن پر غور وفکر اور تدبر کے کچھ قاعدے مقرر کیے، کچھ اصول بنائے۔ جن اصولوں اور قاعدوں کی پابندی کر کے کوئی بھی شخص قرآن کے اصل اور حقیقی معنوں تک رسائی حاصل کر سکتا ہے۔ اپنے انھیں اصول ونظریات کو عملی جامہ پہنانے کے لیے مولانا فراہی نے

قرآن کی بعض سورتوں کی تفسیر بھی لکھی۔اس ضمن میں مولانا فراہی کی کتاب ''مجموعہ تفاسیر فراہی'' بہت اہم ہے۔ جو قرآن کے آخری پاروں کی 14 سورتوں پر مشتمل ہے۔ان سورتوں کی تفسیر کو پڑھنے کے بعد مولانا فراہی کی قرآن کی تفسیر پیش کرنے کی منشا سے متعلق جو معلومات حاصل ہوتی ہیں اسے علامہ خالد مسعود اپنے لفظوں میں یوں بیان کرتے ہیں کہ:

> ''مولانا فراہی نے اس دور میں قرآن کے فہم کی ایک نہایت قابل اعتماد اور بے خطر راہ کھولی ہے۔ وہ چاہتے تھے کہ لوگ اس سرچشمۂ فیض سے سیراب ہوں اور کتاب الٰہی کی حکمتوں کے خزانوں سے اپنے دامن بھریں۔اس عمل میں مولاناؒ کے پیش نظر یہ بات تھی کہ قرآن حکیم کو مرکز بنا کر تمام اسلامی علوم کو از سر نو مرتب کر دیا جائے تاکہ آدمی پر جو دروازہ بھی کھلے وہ قرآن کی رو سے کھلے اور وہ جس راہ پر بھی چلے قرآن کی روشنی اس کی رہنمائی کرے۔ مولاناؒ کے نزدیک یہی راستہ مسلمانوں کے علم کی درستی کا ہے اور اس نتیجہ میں ایک صحیح قسم کا فطری بپا ہونے کی امید ہے۔اگرچہ مولاناؒ کی زندگی اتنی وفا نہ کی کہ وہ یہ سارے کام از سر نو خود انجام دے سکتے لیکن انھوں نے اس بارے میں واضح اشارات چھوڑے ہیں اور کام کا خاکہ تک ترتیب دے دیا ہے۔اب یہ ان کے بعد آنے والوں کا کام ہے کہ ان کے فکر کو نہ صرف زندہ رکھیں بلکہ ترقی دے کر دنیا میں علم صحیح کے علم بردار بنیں۔اس کے نتیجہ میں یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ زمانہ اسلام کی حقانیت اور برتری کا قائل ہو سکے اور مسلمان اپنا کھویا ہوا وقار بھر حاصل کر لیں۔''

توضیحات فکر فراہی، علامہ خالد مسعود، مجلس مرکزیہ حزب الانصار (جلد اول)، بھیرہ، 2016ء، صفحہ 153،

مذکورہ بالا تصانیف کے علاوہ مولانا فراہی نے چند اور قیمتی اور اہم کتابیں تحریر فرمائی ہیں جن کے مطالعے سے مولانا فراہی کے افکار و نظریات اور قرآن کے تعلق سے ان کی سنجیدگی کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔مثلاً مفرادات القرآن، دلائل النظام، اسالیب القرآن اصول التاویل، حکمۃ القرآن، فی ملوک اللہ، حج القرآن، القائد الی العیون العقائد، احکام الصول باحکام الرسول، الرای فی اصول الشرائع وغیرہ مولانا

فراہی کی وہ کتابیں ہیں جن سے ان کی ذہنی بلندی اور قرآن کے متعلق حساسیت اور سنجیدگی کا پتا چلتا ہے۔

مولانا فراہی نے قرآن کے مطالعہ کے کچھ بنیادی اصول مرتب کیے تھے اور ان ہی اصولوں کی بنا پر وہ قرآن کی خود بھی تفسیر پیش کرتے آئے اور اپنے شاگردوں کے لیے بھی انھوں نے ان اصول و نظریات کی اہمیت وافادیت کو اچھی طرح سے گوش گزار کرادیا تھا۔ان کی اسی کوششوں کی وجہ سے ان کے شاگردوں میں قرآن فہمی کا جو سلسلہ دیکھنے کو ملتا ہے وہ دوسری جگہ کمیاب ضرور ہے۔ان کے شاگردوں میں مولانا امین احسن اصلاحی نے قرآن کی مکمل تفسیر 'تدبر قرآن' کے نام سے کئی جلدوں میں لکھی۔ان کی اس تفسیر کی بنیاد مولانا فراہی کے بیان کردہ اصولوں پر ہی ہے۔مولانا فراہی نے بھلے مکمل تفسیر نہ لکھی ہو مگر ان کے شاگرد امین احسن اصلاحی نے ان کی منشا کو 'تدبر قرآن' کے ذریعہ پیش کیا ہے۔مولانا امین احسن اصلاحی تدبر قرآن کے دیباچے میں لکھتے ہیں کہ:

> ''تفسیر تدبر قرآن پر میں نے اپنی زندگی کے پورے ۵۵ سال صرف کیے ہیں۔ جن میں ۲۳ سال صرف کتاب کی تحریر وتسوید کے نذر ہوئے ہیں۔اگر اس کے ساتھ وہ مدت بھی ملادی جائے جو استاذِ امام رحمۃ اللہ علیہ نے قرآن کے غور وتدبر پر صرف کی ہے اور جس کو میں نے اس کتاب میں سمونے کی کوشش کی ہے تو یہ کم و بیش ایک صدی کا قرآنی فکر ہے جو آپ کے سامنے تفسیر 'تدبر قرآن' کی صورت میں آیا ہے۔اگرچہ میں اپنے فکر کو حضرت الاستاذ علیہ الرحمۃ کے فکر کے ساتھ ملانا بے ادبی خیال کرتا ہوں،لیکن چونکہ واقعہ یہی ہے کہ میں نے عمر بھر استاذ ہی کے سُر میں اپنا سُر ملانے کی کوشش کی ہے اور میرا فکر ان کے فکر کے قدرتی نتیجہ ہی کے طور پر ظہور میں آیا ہے،اس وجہ سے یہ جوڑ ملانے کی جسارت بھی کر رہا ہوں۔اگر یہ بے ادبی ہے تو اللہ تعالیٰ اسے کو معاف فرمائے۔''

مولانا امین احسن اصلاحی،تدبر قرآن،فاران فاؤنڈیشن،لاہور،پاکستان،2009ء،صفحہ 7،

مولانا امین احسن اصلاحی پر مولانا فراہی کے فکری نظریات کی گہری چھاپ تھی۔اور فکر فراہی کا نقش مولانا اصلاحی پر اتنا گہرا تھا کہ انھوں نے مولانا فراہی کی تربیت میں رہنے کے بعد سے لے کر اپنی پوری زندگی فکرِ فراہی کے ترویج واشاعت میں لگادی۔اور اس کام کا ثمرہ انھیں 'تدبر قرآن' کی صورت میں

حاصل ہوا۔ یہ اقتباس سے استاد و شاگرد کے مابین اس رشتہ کو بھی واضح کرتا ہے جو عقیدت ایک حقیقی شاگرد کو اپنے استاد سے ہونی چاہیے۔ مولانا فراہی کا اپنے شاگردوں سے رشتہ استاد و شاگرد کا کم ایک محسن و مربی کا زیادہ تھا۔ مولانا کے تمام ہی شاگرد ان کی دلی عزت کرتے تھے۔ سید سلیمان ندوی تو یہاں تک کہتے ہیں کہ ان کو دیکھ کر خدا یاد آتا تھا۔ (یادرفتگاں، ص 126-125) سید سلیمان ندوی کو بھی مولانا فراہی کی کافی قربت حاصل رہی اور اس تعلق سے وہ جگہ جگہ اپنی تحریروں میں اس بات کا ذکر بھی کرتے ہیں اور مولانا فراہی سے اپنے تعلقات کو خوش نصیبی کے طور پر بیان کرتے ہیں۔

قرآن کے ساتھ ساتھ مولانا فراہی حدیث کی اہمیت سے بھی انکاری نہیں ہیں۔ وہ قرآن کی تفسیر کے لیے حدیث کو معاون سمجھتے ہیں۔ مولانا فراہی کے مطابق قرآن کی تفسیر کی پہلی صورت تو یہ ہے کہ قرآن کی تفسیر قرآنی آیات سے کی جائے اور اگر کوئی حدیث اس کے نظم اور سیاق کے مطابق ہو تو اسے معاونت کے طور پر پیش کرنا بہتر ہوگا۔ مولانا فراہی کے مطابق بعض جگہ ایسی صورت بھی پیدا ہو سکتی ہے جہاں حدیث کا مفہوم قرآن کے سیاق سے میل نہ کھاتا ہو تو ایسی صورت میں ان احادیث کی تاویلیں پیش کرنی چاہیے۔ کیونکہ درجے کے اعتبار سے قرآن اور احادیث میں بڑا فرق ہے۔ لہٰذا ان سے ثابت شدہ احکام کو سمجھنا بھی ضروری ہے۔ مولانا فراہی کے مطابق قرآن کا فرمان قطعی ہے۔ اس میں ظن، سہو یا وہم کی کوئی گنجائش نہیں جبکہ احادیث میں اس طرح کی گنجائش ممکن ہے۔ یہاں مولانا کا نکتۂ نظر جمہور علماء کے خلاف ہو جاتا ہے۔ جمہور علماء کے نزدیک قرآن کی تفسیر صرف قرآن کے ذریعہ کرنا درست نہیں۔ قرآنی آیات کے ساتھ ساتھ سنت اور اقوال سلف نیز صحابہ کرام کی زندگیوں کے ذریعہ قرآن کی تفسیر پیش کرنی چاہیے۔ مولانا فراہی قرآن کی تفسیر میں ان چیزوں کو فروعی حیثیت دیتے ہیں۔ اس تعلق سے ان کے نظریات کا ترجمہ پیش کیا جا رہا ہے جو انھوں نے اپنی کتاب نظام القرآن میں بیان کیے ہیں:

> ''یہاں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ قرآن اپنی تفسیر کے لیے ان فروع کا محتاج نہیں۔ وہ تمام کتابوں کے لیے خود مرکز و مرجع کی حیثیت رکھتا ہے اور جہاں کہیں اختلاف واقعہ ہو تو اسی کی روشنی جھگڑے کو چکانے والی بنے گی۔ لیکن اگر تم کو قرآن مجید کی تصدیق و تائید کی ضرورت ہو تو ان فروع کی مراجعت سے تمہارے ایمان و اطمینان میں اضافہ ہوگا۔''

حمیدالدین فراہی، نظام القرآن وتاویل الفرقان فی الفرقان، دائرہ حمیدیہ، اعظم گڑھ، 2008ء، صفحہ 29

اس اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مولانا فراہی قرآن مجید کی تفسیر کے ضمن میں احادیث، آثار اور اقوال صحابہ وغیرہ کو فروعی شئے سمجھتے ہیں۔ اور چاہتے ہیں کہ قرآن مجید کی تفسیر کی بنیاد خود قرآنی آیات ہوں۔ اسی کے ذریعہ سے قرآن مجید کی صورتوں میں نظم باقی رہے گا اور بدعات وضلالت کی کجرویوں سے بھی دوری اختیار کی جاسکتی ہے۔ مولانا فراہی کے مطابق قرآن مجید کی تفسیر پیش کرتے وقت مندرجہ ذیل نکات کو سامنے رکھنا ضروری ہے۔

(1) تفسیر میں مراجع کی حیثیت قرآن کو حاصل ہونی چاہیے۔ البتہ احادیث کو تائید وتصدیق کے لیے پیش کیا جانا چاہیے۔

(2) احادیث میں سے وہی چیزیں لینی چاہیے جو نظم قرآن کی تائید کریں جو احادیث نظم قرآن کو متاثر کردیں ان کی تاویل کرنی چاہیے۔

(3) صرف وہ احادیث قبول کرنی چاہیے جو قرآن کی تصدیق وتائید کریں۔

(4) ان احادیث کو قبول نہیں کرنا چاہیے جو نصوص قرآنی کی تکذیب کرتی ہوں۔

(5) قرآن اور احادیث کا درجہ برابر نہیں ہے لہٰذا ان سے ثابت شدہ احکام میں بھی فرق کرنا چاہیے کیونکہ قرآن قطعی ہے اور حدیث میں وہم وظن کی بہت گنجائش ہے۔

(6) پسندیدہ تفسیر وہی ہے جو رسول اور صحابہ سے منقول ہو۔

مولانا فراہی کی زندگی کی ایک دوسری تصویر بحیثیت شاعر اور ادیب کے بھی ہے۔ مولانا فراہی کی روح میں ادب شناسی کا گوشہ بھی پنہا تھا اور اسی وجہ سے انھوں نے وقتاً فوقتاً شاعری بھی کی۔ مولانا فراہی کا اصل میدان تو قرآنیات ہے۔ اور انھوں نے قرآن کی تعلیم اور اس پر غور وفکر کرنے کو اپنی زندگی کا مقصد بنایا۔ خود بھی قرآن کی تعلیم کو عام کرنے کی طرف زیادہ توجہ دی اور لوگوں نے بھی مولانا فراہی کی شخصیت کو قرآن سے متعلق ان کی تصانیف سے ہی سمجھا۔ ان سب کی وجہ سے مولانا فراہی کو ایک شاعر کی حیثیت سے دیکھے جانے میں کہیں نہ کہیں غفلت برتی گئی ہے۔ یہی وجہ رہی کہ آج مولانا فراہی کو ان کی نظم قرآن اور قرآنیات سے متعلق کتابوں کے حوالے سے تو جانا پہچانا جاتا ہے لیکن یہ بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ مولانا فراہی نے اپنے دیوان کا ایک مجموعہ ''دیوان المعلم عبدالحمید الفراہی'' کے نام سے چھوڑا۔ جس

میں 15 عنوانات کے تحت کل 290 اشعار درج ہیں۔ مولانا فراہی کی شعری ادب سے وابستگی کا اندازہ اس قصیدے سے لگایا جا سکتا جو انھوں نے محض 17-16 سال کی عمر میں فارسی میں تحریر کیا تھا۔ جس پر نہ صرف شبلی کو بلکہ ان کے استاد مولانا فاروق چریا کوٹی کو بھی بڑی حیرت ہوئی تھی۔ شبلی نے جب پہلے پہل مولانا فراہی کا نام بتلائے بغیر ان کو قصیدہ پڑھنے کو دیا اور پوچھا کہ بتایئے کس کا ہے۔ اس کے جواب میں مولانا چریا کوٹی نے کہا کہ نام تو نہیں معلوم ہاں مگر کسی استاد کا کلام لگتا ہے۔ بعد میں شبلی نے جب انھیں بتایا کہ حمید نے لکھا ہے تو انھیں سخت حیرت ہوئی کہ اتنی مشکل ردیف کے ساتھ محض 17-16 برس کا طالب علم کیسے قصیدہ گوئی کر سکتا ہے۔ یہ تو ایک مثال تھی جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اوائل عمر سے ہی مولانا فراہی میں علم وادب کا ذوق اور شعر گوئی کی صلاحیت تھی۔ مولانا فراہی نے بھی شعر گوئی کی اور اپنی اس صلاحیت کو ضائع نہیں ہونے دیا۔ وہ چونکہ بیک وقت عربی وفارسی دونوں زبانوں کے ماہر تھے۔ اس لیے انھوں نے ان دونوں زبانوں میں شاعری کی لیکن فارسی سے زیادہ عربی میں شعر گوئی کو زیادہ فوقیت دی۔ عربی میں ان کا پہلا قصیدہ علامہ شبلی کو شمس العلماء کا خطاب ملنے کی خوشی میں تحریر کیا۔ قصیدے کا شعر ملاحظہ ہو:

یــا خبــر مــن یســمــو الــی الــعــلــمــاء
کــالشــمــس بــازغة مــوســط ســمــاء

قصیدے کا آخری بند اس طرح ہے:

ان کــان تــلك الشــمــس سمائها　　فــلـصــرت شــمــس العلم والعلماء
اذا انــت شمس والعلوم سمائها　　فالشمس شمسی والسماء سمائی

مولانا فراہی نے اپنی شاعری کو مقصد کے تحت استعمال کیا۔ ان کے نزدیک شاعری محض دل بہلانے یا اپنا غم ہلکا کرنے کا ذریعہ نہ تھی۔ انھوں نے اپنی شاعری کے ذریعہ قرآن کی تعلیمات کو عام کرنے کی کوشش کی۔ اور اپنی شاعری میں قرآن کے ذریعہ مسلمانوں کو پستی سے نکالنے کی کوشش کی۔ اس طرح سے انھوں نے اپنی شاعری کو دعوت اسلامی کو پھیلانے کا ذریعہ بنایا۔ مولانا فراہی شعر کی اہمیت سے خوب واقف تھے۔ عربی ادب کے طالب علم ہونے کی وجہ سے انھوں نے اس بات سے انکار نہیں کیا کہ شعر میں وہ طاقت ہوتی ہے کہ کمزور پڑے شخص میں بھی طاقت کی روح پھونک دے۔ اسی مقصد کے تحت انھوں نے شاعری کی اور اپنی شاعری میں مسلمانوں سے خطاب فرمایا۔ اور انھیں مایوسی سے نکال کر عظم وحوصلے

کے ساتھ باطل کے سامنے ڈٹ کر کھڑے رہنے کی تلقین کی۔ ان کا یہ شعر دیکھیے :

لا تهـــولـــنك ليـــلة عـــكـــرت

ان بـــعـــض الـــظـــلام انـــوارا

زراغور کریں قرآن کی آیت ان مع العسر یسرا کا مصداق معلوم ہوتا ہے۔ مولانا فراہی کے اکثر اشعار میں اسی قسم کی قرآنی آمیزش نظر آتی ہے۔ جو کبھی بالواسطہ یا کبھی کبھی قرآن کی آیت ہی کو شعر میں سموکر شعر مکمل کر دیتے ہیں۔ اس طرح سے قرآن کی آیات کے استعمال سے ان کے اشعار میں نغمگی کے ساتھ ساتھ رنگینیت بھی سرایت کر جاتی ہے۔ اور اشعار کا مفہوم وسیع سے وسیع تر ہو جاتا ہے۔ اشعار دیکھیے :

استـنـصـروا الـلـه المهيمن فـی الـعشـی و فـی الغلـس

ولیـنـصـرن الـلـه من یـنـصـره، فلیـحتمـس

اس شعر میں ولینصرن من ینصره کی آیت کریمہ کو نہایت مہارت اور قابلیت کے ساتھ سمودیا گیا ہے۔ ایک دوسرے شعر میں نصر من الله و فتح قریب کی آیت کو خوش اسلوبی کے ساتھ شعر کا مصرع بنادیا گیا ہے:

یـا قـومـنـا ان تـنـصـروا یـاتکم

نـصـر مـن الـلـه و فتـح قـریـب

قرآن کی آیت میں شعریت کا کس قدر عنصر ہے اس کی مثال اس شعر سے بہتر کم ہی جگہ ملے گی۔ اپنی قوم کو خطاب کرنا اور ایک دوسرے کی مدد کے لیے ابھارنا اس خوش اسلوبی کے ساتھ کہ اس میں شعر کی رنگینی اور نغمگی حد درجہ پر اثر معلوم ہوتی ہے۔ دیوانِ حمید میں ہمیں اس طرح کے بیشتر اشعار ملیں گے۔ جس میں شاعر نے مسلمانوں کو قرآن کی تعلیم کے ذریعہ پیغام دینا چاہا ہے اور اپنی قوم کو مایوسی اور پستی سے نکالنے کی کوشش کی ہے۔ یہی وہ خصوصیت تھی جو شبلی اپنے شاگردوں میں دیکھنے کے خواہاں تھے۔

☆☆☆